محمد خاور نوازش

اُردو اور ہندی کی وحدت: چند بنیادی نکات

وہ زبان جو کئی صدیوں تک پورے برصغیر میں رابطے کا ذریعہ رہی اور جس کا خمیر خالصتاً ہندوستانی تھا ہندو مسلم اختلافات اور سیاسی مصلحتوں کے زیرِ اثر اُردو اور ہندی میں تقسیم ہوگئی۔ آج ہم خواہ ہزار بار دہرائیں کہ اُردو اور ہندی لسانیاتی اعتبار سے دو الگ زبانیں نہیں ہیں، پوری دنیا انھیں دو الگ زبانیں تسلیم کرتی ہے۔ یہ زبانیں اپنے کروڑوں بولنے والوں اور وسیع ادبی ذخائر کی بنا پر بلاشبہ جداگانہ حیثیت کی حامل ہیں۔ اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں زبانوں کے اُن ہی کروڑوں بولنے والوں یا کسی تیسری زبان بولنے والے کے سامنے اردو اور ہندی بول چال کا ایک ایک نمونہ رکھیں تو وہ بمشکل ان میں فرق کر پائے گا۔ جب یہ دو الگ زبانیں تسلیم کی جاتی ہیں تو پھر ان میں وحدت کیوں کر محسوس ہوتی ہے؟ اس سوال پر غور کیا جائے تو اُردو اور ہندی کی وحدت کا اولین سبب نسلی اشتراک ہے۔ اردو اور ہندی کے آغاز سے متعلق اب تک جتنے نظریات منظرِ عام پر آچکے ہیں انھیں آسانی کے ساتھ دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے زمرے میں وہ لوگ شامل ہیں جو ان زبانوں کا ماخذ ذخیرۂ الفاظ، صوتیات اور تاریخی تناظر کی بنا پر تلاش کرتے ہیں اور دوسرے زمرے میں وہ علما شامل ہیں جو خالصتاً لسانیاتی انداز زبان کے ڈھانچے کی بنا پر ماخذ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان نظریات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ پہلے زمرے کے لوگ اپنے خیالات سے نہ صرف لسانیات سے ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں بلکہ تحقیقی تقاضے بھی پورے نہیں کرتے۔ اُن کی تحقیق کو اپنا مفروضہ درست ثابت کرنے کی کوشش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس زمرے میں شامل اُردو کے محققین ہر طرح سے اُردو زبان کی بالادستی قائم رکھنا چاہتے ہیں جب کہ ہندی کے محققین اردو کو ایک مصنوعی زبان ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اس زمرے کے محققین کا خیال ہے کہ سماجی لسانیات کو اُردو اور ہندی کے آغاز کے حوالے سے بنیادی اہمیت دی جانی چاہیے۔ دوسرے زمرے میں شامل علما زبان کا مطالعہ سائنسی انداز میں کرتے ہیں۔ وہ زبان کے صرفی ونحوی ڈھانچے کو بنیادی اور ذخیرۂ الفاظ اور صوتیات کو ثانوی اہمیت دیتے ہیں اور تحقیق کے دوران اپنے مفروضے کے موافق اور مخالف دونوں طرح کے نظریات اور دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے علما تقابلی لسانیات اور توضیحی لسانیات کو سماجی لسانیات پر مقدم سمجھتے ہیں۔ اس زمرے میں شامل لوگوں نے علم کو تنگ نظری سے دیکھا ہے نہ ہی تحقیق میں تعصب کو کوئی جگہ دی ہے

اسی لیے اُن کی تحقیقات کو اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے آغاز کے حوالے سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ اُردو اور ہندی پر لسانیاتی انداز میں تحقیق کرنے والے بیشتر علما کے خیال میں یہ مشترک الماخذ زبانیں ہیں۔

اردو اور ہندی، زبانوں کے، ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب ہند آریائی خاندان کا حوالے آتا ہے تو اس کا دوسرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں زبانوں کا شجرۂ نسب سنسکرت اور اس سے بھی پہلے ویدک زبان سے جا ملتا ہے۔ دراصل سنسکرت کی کلاسیکی منزل کے ساتھ ہی پراکرتوں کا ظہور اور پھر اپ بھرنشوں کا عہد آتا ہے۔ اردو اور ہندی کا براہِ راست ماخذ ہند آریائی کے ارتقا کی تیسری منزل پر شورسینی اپ بھرنش کی صورت ملتا ہے جو مدھیہ دیش اور بالخصوص دوآبہ گنگا و جمنا کی زبان تھی۔ اس علاقے کو ہندوستان میں مرکزی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے یہاں کی زبان پورے ملک میں ہمیشہ رابطے کی زبان کے طور پر رائج رہی۔ ۱۰۰۰ء کے بعد شورسینی اَپ بھرنش سے جن جدید بولیوں نے ارتقا پایا اُن میں سے ایک کھڑی بولی تھی۔ کھڑی بولی کے اولین نمایاں آثار سے لے کر اس کی مستقل صورت ظاہر ہونے تک کا درمیانی عرصہ کم و بیش تین سے چار سو برس کا ہے۔ اس عرصے کو زبان کا تشکیلی دور کہا جانا چاہیے لیکن اُردو اور ہندی زبانوں کے مورخین اپنی اپنی زبان کو زیادہ قدیم ظاہر کرنے کی دھن میں ۱۰۰۰ء سے بھی پہلے کے ادبی نمونوں کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ ہم اُن نمونوں کی اہمیت سے اس لیے منکر نہیں ہو سکتے کہ اُن میں مستقبل کی زبان کے آثار ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اُن آثار کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کھڑی بولی اُس وقت بھی موجود تھی۔ اصل مسئلہ زبان کے ذخیرۂ الفاظ کو تشکیلی عناصر میں سب سے زیادہ اہمیت دینے سے شروع ہوتا ہے۔ موجودہ اُردو میں سنسکرت کے الفاظ موجود ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اردو دو ہزار سال پرانی زبان ہے۔ اُردو اور ہندی کا براہِ راست رشتہ کھڑی بولی کے ساتھ ہے تاہم کھڑی بولی میں بدیسی زبانوں کے الفاظ شامل ہونے کی بنا پر جب یہ لغو خیال فروغ پانے لگا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور باہر سے ہندوستان میں آئی تو ضروری ہو گیا کہ کھڑی بولی کے ماخذ کو سامنے لایا جائے۔ اپ بھرنش کے متون کو سامنے رکھتے ہوئے ماہرینِ لسانیات نے کھڑی بولی کے صرفی و نحوی ڈھانچے کو شورسینی اپ بھرنش پر استوار ثابت کیا ہے جس کا اصل اور بڑا مقصد اپنی زبان کی ہندوستانی اساس واضح کرنا تھا۔ جارج گریرسن نے مدھیہ دیش کی شورسینی اپ بھرنش سے ماخوذ بولیوں کے لیے مغربی ہندی کی اصطلاح استعمال کی اور مغربی ہندی میں سب سے زیادہ اہم کھڑی بولی جسے پہلی دفعہ 'ہندوستانی' کا نام سترہویں صدی میں انگریز سیاحوں نے ہندوستان کی لنگوا فرانکا ہونے کی وجہ سے دیا تھا' کی بابت لکھتے ہیں کہ:

'Hindostani, as a local vernacular, is spoken in Western Rohilkhand, the Upper Gangetic Doab, and the Panjab District

of Ambala. It has also been carried over the whole o India by Musalman conquerors, and has received considerable literary culture. Under these conditions it has three main varieties, Literary Hindostani proper, employed by both Musalmans and Hindus for literary purposes and as a lingua franca; Urdu, employed chiefly by Musalmans and by Hindus who have adopted the Musalman system of education, and a modern development, called Hindi, employed only by Hindus, who have been educated on a Hindi system."[1]

گویا ہندوستانی کے ادبی رُوپ کو چھوڑ کر ذریعہ اظہار کے دو رُوپ ہیں، مسلمانوں نے جس کی پرداخت کی وہ اردو ہے اور ہندوؤں نے جس کی پرورش کی وہ ہندی ہے لیکن ان دونوں میں سے موخر الذکر کو زبان کے باب میں نسبتاً جدید (نئی/تازہ) پیش رفت گردانا جاتا ہے۔ ہم ہندوستانی کو کھڑی بولی کہنا زیادہ مناسب اس لیے سمجھتے ہیں کہ یہ نام انیسویں صدی عیسوی سے پہلے ہندوستان میں عام نہیں ہوا تھا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ نام اردو اور ہندی کی درمیانی صورت نکالنے کے لیے بیسویں صدی میں گاندھی جی نے بھی تجویز کیا۔ اردو ہندی تنازع کے موضوع پر گیان چند جین کی کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' کو ایسی تازہ پیش رفت (گو کہ اسے شائع ہوئے بھی اب دس برس ہونے کو ہیں) سمجھا جاسکتا ہے جس نے حالیہ صدی کے پہلے عشرے میں اس موضوع کو ایک دفعہ پھر زندہ کر دیا۔ اس کتاب کے جواب میں بہت سے علما کی کتابیں اور مضامین منظرِ پر آئے جن سے اگلے صفحات پر مختلف حوالے شامل کیے جائیں گے۔ فی الحال گیان چند جین کے اُردو اور ہندی کے حوالے سے چند بیانات ملاحظہ کریں جن سے ان کے ذہن میں موجود ان زبانوں کی تعریف واضح ہوتی ہے:

''اتنا تو بہر حال سبھی مانتے ہیں کہ اردو ایک ہند آریائی ہندوستانی زبان ہے جو باہر سے نہیں آئی۔ اس کا جدی شجرہ فارسی یا عربی تک نہیں پہنچتا بلکہ کھڑی بولی، اپ بھرنش وغیرہ سے ہوتا ہوا سنسکرت اور ویدک زبان تک پہنچتا ہے۔''[2]

''اُردو اور ہندی بول چال کی شکل میں ایک زبان ہیں لیکن تحریری رُوپ میں اختلاف کی طرف گامزن ہیں جس کے سبب دونوں کا ادب مختلف ہو جاتا ہے۔''[3]

''اُردو اور ہندی دونوں کھڑی بولی کے دو ادبی رُوپ ہیں... کھڑی بولی گیارہویں سے تیرہویں صدی کے بیچ قدیم مدھیہ دیش کے علاقے میں شورسینی اپ بھرنش سے رونما ہوئی، اس نے اُردو روپ چودھویں صدی سے دکن میں اور سترہویں صدی سے شمال میں اختیار کیا۔ یہ دراصل ادبی

روپ ہے۔ واضح ہو کہ لسانیات میں تقریری روپ ہی معتبر ہوتا ہے۔ ادبی روپ ادبیات والوں کی چیز ہے لسانیات والوں کی نہیں۔ یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ بول چال کی حد تک اُردو اور ہندی بولنے والے عوام کی بولی بالکل ایک ہے۔ شہروں کے پڑھے لکھوں کی مجلسی اور تہذیبی گفتگو چھوڑ دیجیے۔ گھریلو بول چال میں سب ایک ہی بولی بولتے ہیں۔''[۴]

''جہاں تک بول چال کا تعلق ہے۔ ابتدا سے آج تک اُردو اور ہندی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ یہ ایک ہی زبان کے دو رُخ ہیں' بلکہ ایک ہی زبان ہیں۔''[۵]

''مجھے تسلیم ہے کہ اُردو اور ہندی دو مختلف ادب ہیں' لیکن زبانیں نہیں... دخیل الفاظ سے زبان کا تعین نہیں ہوتا۔ رسم الخط کا فرق بھی اسی طرح ایک زبان کے دو حصے نہیں کر سکتا' جس طرح رسم الخط کی مطابقت دو زبانوں کو ایک نہیں کر سکتی۔''[۶]

درج بالا بیانات گیان چند جین کی مختلف تحریروں سے لیے گئے ہیں۔ پہلے دونوں 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ دو ادب' تیسرا 'عام لسانیات کے تیئیسویں باب بعنوان 'ہند آریائی خاندان' جبکہ آخری دونوں ۱۹۷۳ء میں شائع ہونے والے ایک مضمون جو اُن کے تنقیدی مجموعے 'حقائق' میں بھی شامل ہے، سے لیے گئے ہیں۔ کہیں پر بھی انھوں نے اُردو اور ہندی کو دو الگ زبانیں قرار نہیں دیا بلکہ یہ ایک طرح سے جارج گریرسن کے خیال کی ہی توسیع ہیں۔ اصل مسئلہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ ایک طرف زبان کے فطری ارتقا پر یقین رکھتے ہیں تو دوسری طرف یہ کہتے ہیں کہ بیرونی حملہ آوروں نے اپنے اقتدار اور احساسِ برتری کے نشے میں ہندوستانی زبان اور لپی کو قبول نہ کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی علیحدہ مسجد بنائی[۷] حالانکہ اگر یہ علیحدہ مسجد بنانی ہوتی تو پھر فارسی کی بنانے سے مسلمانوں کو کون روک سکتا تھا' وہ لگاتار سات سو برس ہندوستان کے حکمران رہے، حکمرانی کا نشہ زبان پر غالب آتا تو خود گیان چند جین کے بقول ایران میں آنے والی تبدیلیاں یہاں بھی آتیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انگریزوں کا ایک سے ڈیڑھ سو سال کا دورِ حکومت کھڑی بولی پر جس طرح اثر انداز ہوا اُسے ذہن میں رکھتے ہوئے ذرا تصور کیجیے کہ انگریز اسی طرح سات سو سال لگاتار یہاں حکومت کرتے تو اس زبان کی صورت کیا بنتی! ہم اپنی زبان سے گہری محبت کے باوجود یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ ایسی صورت میں ہندوستانی رومن رسم الخط میں لکھی جا رہی ہوتی اور اس میں لاطینی، یونانی، جرمن، ڈچ، پرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی کے الفاظ کی تعداد پچاس فی صد کے لگ بھگ ہوتی بشرطیکہ یہ التزام بھی ہوتا کہ انگریزوں نے مسلمانوں کی طرح ہندوستان کو اپنا دیس بنا لیا ہوتا۔ گیان چند جین پر محققین کی طرف سے سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جاتا ہے کہ وہ معروضی حقائق کو سامنے رکھے بغیر زبان کے ارتقا پر متعصبانہ نظر ڈالتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمان ہندوستان میں رچ بس جانے اور محمود غزنوی سے لے کر مغلوں کے زوال تک کا

طویل عرصہ گزارنے کے بعد بھی گیان چند جین کے ہاں بیرونی ہی شمار ہوتے ہیں۔ عبدالستار دلوی لکھتے ہیں کہ:

''کوئی بھی قوم کسی بھی زبان کو گھوڑوں پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں لے جاتی۔ زبانیں فطرتاً تشکیل پاتی ہیں۔ کبھی کبھی ان کے تشکیل پانے میں بیرونی اثرات یا زبانوں کا ربط تازیانہ کا کام کرتا ہے۔ اُردو اس لسانی ربط باہمی کا نتیجہ ہے جس کے گیان چند جین صاحب منکر ہیں۔''[۷]

لسانی ربطِ باہمی کے گیان چند جین صاحب ہی نہیں' ماہرینِ لسانیات کی بڑی تعداد منکر ہے کیوں کہ اس کے ذریعے کسی نئی زبان کا بننا بالکل بے بنیاد بات ہے۔ لسانی ربطِ باہمی زبان پر صرف لغت اور صوتیات کی حد تک اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اُردو اور ہندی جس ماخذ سے براہِ راست ارتقا پاتی ہیں وہ کھڑی بولی ہے اور کھڑی بولی نے باہر سے آنے والے مسلمانوں اور مقامی لوگوں کے لسانی ربطِ باہمی سے اثرات قبول ضرور کیے لیکن اصل نکتہ یہ ہے کہ ایک تو یہ عمل فطری تھا اور دوسرا زبان نے اپنا ڈھانچہ تبدیل نہیں کیا۔ گیان چند جین صاحب جب اُردو کی تشکیل کو مسلمانوں کی شعوری کاوش سمجھتے ہیں تو اول تو وہ اپنے ہی اُس قول کی تردید کرتے ہیں کہ زبان کی تشکیل شعوری نہیں ہوتی اور دوم اُس خیال کا رَد بھی تلاش کر لیتے ہیں جو اُردو والے للولال کوی کی ہندی تشکیل سازی کی بابت پیش کرتے ہیں۔ اُردو اور ہندی خواہ آج مستقل صورت میں دو الگ زبانیں تسلیم کی جاتی ہیں لیکن ان کی وحدت کی دلیل بننے والی لسانیاتی مماثلت آج بھی عیاں ہے۔ مرزا خلیل احمد بیگ رقم طراز ہیں کہ:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں زبانوں کی اساس، بنیاد اور قواعدی ڈھانچہ ایک ہے اور اس کا ایک تاریخی سبب ہے۔ کیوں کہ دونوں زبانیں شورسینی اپ بھرنش اور اس کے بعد کھڑی بولی سے ماخوذ ہیں۔ لہٰذا ان دونوں میں لسانیاتی مماثلت کا پایا جانا ناگزیر ہے۔''[۸]

رام بلاس شرما ان دونوں زبانوں کی مشترک اساس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''ہندی اُردو کی ایک مشترکہ بنیاد ہے۔ بول چال کی کھڑی بولی میں عربی فارسی کے کچھ، یا بہت زیادہ الفاظ آملے تو اس سے ایک نئی زبان نہیں پیدا ہو گئی۔ یہ کھڑی بولی مسلمانوں کے آنے سے پہلے ہی تھی ان کے زمانہ حکومت میں رہی اور آج بھی ہے..... باہر سے جو مسلمان یہاں آئے وہ بہت جلدی یہاں کی قومیت کا حصہ بن گئے، وہ اپنے آپ کو ترک' پٹھان اور مغل کہتے تھے لیکن یہ پرانی ذاتوں کی یادگار تھی۔ قومیت کا خاص نشان زبان اس سے بہت جلدی چھوٹ گیا۔''[۹]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی رائے ملاحظہ کریں:

''جتنا گہرا رشتہ اُردو اور ہندی میں ہے شاید دنیا کی کسی دو زبانوں میں نہیں۔ دونوں کی بنیاد اور ڈول اور کینڈا بالکل ایک ہیں، یہاں تک کہ کئی بار دونوں زبانوں کو ایک سمجھ لیا جاتا ہے۔ دونوں ایک ہی

سرچشمے سے پیدا ہوئیں جس کے بعد دونوں کا ارتقا الگ الگ سمتوں میں ہوا اور دو اہم لسانی اور ادبی روایتیں وجود میں آ گئیں۔'' ۱۰

اُردو اور ہندی کے مشترک ماخذ کھڑی بولی کا الگ الگ سمتوں میں لسانی ارتقا اٹھارویں صدی عیسوی میں ہی شروع ہو گیا تھا لیکن اسے تحریک فورٹ ولیم کالج میں ملی۔ ہندی کے کچھ مورخین جب کھڑی بولی سے زیادہ اہمیت برج بھاشا کو دیتے ہیں بلکہ اسے ہندی کا ماخذ بھی سمجھتے ہیں جو لسانیاتی حوالے سے درست نہیں، تو بھی وہ اپنی زبان کی بنیاد پوری طرح اُردو سے الگ نہیں کر پاتے کیوں کہ برج بھاشا اور اُردو ایک منزل پیچھے مدھیہ دیش کی شورسینی اپ بھرنش سے ارتقا پذیر نظر آتی ہیں۔ سید احتشام حسین نے جان بیمز کی 'ہندوستانی لسانیات کا خاکہ' مرتب کیا ہے اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اُردو اور ہندی کا مطالعہ کرنے والوں کو سورسینی کا نام ذہن میں رکھنا چاہیے کیوں کہ یہی شورسینی پراکرت کچھ دنوں بعد سورسینی اپ بھرنش میں تبدیل ہوئی اور پھر مغربی ہندی اور مشرقی پنجابی کی مختلف شکلوں کی ماں بن گئی جن میں اُردو اور ہندی بھی شامل ہیں۔ یہ شمالی ہند کے وسطی حصے کی زبان تھی اور سنسکرت سے قریب تھی۔'' ۱۱

اُردو اور ہندی کی ہند آریائی اساس یعنی شورسینی اپ بھرنش ہندوستان میں ہند آریائی کے ارتقا کی تیسری منزل ہے جس سے مغربی ہندی، گجراتی اور راجستھانی ماخوذ ہیں۔ گریرسن نے مغربی ہندی کی اصطلاح شمالی ہند کی اُن بولیوں کے لیے وضع کی جو دہلی اور نواحِ دہلی میں بولی جاتی تھیں۔ ان بولیوں میں سے کھڑی بولی اور برج بھاشا مختلف زمانوں میں سرکاری سرپرستی اور عوامی لگاؤ کی بنا پر مستحکم ادبی روایات کی حامل بن گئیں۔ اُردو اور ہندی دونوں کی اصل کھڑی بولی ہے دونوں زبانیں کھڑی بولی کی سچی جانشین ہونے کی دعوے دار ہیں۔ ان میں بنیادی جھگڑا بھی یہی ہے کہ ایک زبان بولنے والے دوسری زبان کو اپنی زبان کی شیلی کہتے ہیں۔ دراصل دونوں زبانوں کی ارتقائی صورتیں اپنے اپنے مخصوص سیاق کی حامل ہیں جسے لسانیاتی وحدت کے ساتھ گڈمڈ کرنا درست نہیں۔

اُردو اور ہندی کی وحدت کی ایک اور اہم جہت دونوں زبانوں کے وہ مشترک نام ہیں جو ماضی میں رائج رہے۔ ہندی والوں کا کھڑی بولی کی جانشینی پر دعویٰ مضبوط ہو جاتا ہے جب وہ کہتے ہیں کہ کھڑی بولی کے اولین شعرا اور نثر نگاروں نے خود اپنی زبان کو 'ہندی' کہا۔ غالب کے خطوط کے ایک مجموعے کا نام اگر 'اُردوئے معلیٰ' تھا تو دوسرے کا نام 'عودِ ہندی'۔ اٹھارویں صدی کی فارسیت زدہ 'نوطرزِ مرصع' جسے اُردو زبان کی تصنیف ماننا بھی دشوار ہو جاتا ہے' کا مصنف تحسین اپنی زبان کو ہندی کی رنگین صورت بتاتا ہے۔ یہ تو بہت بعد کی مثالیں ہیں، امیر خسرو کو لے لیجیے، گجرات اور دکن کے شعرا اور سترہویں صدی عیسوی میں شمالی ہند کے لکھنے والے اپنی

زبان کو 'ہندی' اور 'ہندوی' کہتے تھے۔ گویا کھڑی بولی اُس وقت بھی 'ہندی رہندوی' کہلاتی تھی جب ابھی اُردو کا یہ نام متعارف نہیں ہوا تھا اور یہ نام متعارف ہونے کے کچھ عرصہ بعد تک بھی کھڑی بولی کو ہندی رہندوی ہی کہا جاتا رہا۔ نام کے اعتبار سے اُردو پر ہندی کے تقدمِ زمانی سے کسی مورخ کو انکار نہیں لیکن لسانی ارتقا کو سامنے رکھا جائے تو ہندی کا یہ تقدمِ زمانی قائم نہیں رہتا۔ کھڑی بولی کی ارتقائی صورتوں میں سے اُردو نے زبان کی مستقل حیثیت ہندی سے پہلے حاصل کر لی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس مستقل زبان کا نام آج بھی 'ہندی' ہو سکتا تھا اگر اس کے فطری پن کے ساتھ ایک طرف حاتم، آرزو اور ناسخ اور دوسری طرف للولال کوی اور سدل مشرا نے انتہائی رویہ اختیار نہ کیا ہوتا۔ ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

> ''۱۸۰۰ء کے قریب موجودہ مفہوم میں ہندی اور اُردو کی اصطلاحات اپنی جداگانہ معنویت حاصل کرتی معلوم ہوتی ہیں اور اس کے لیے فورٹ ولیم کالج سے تحریک ملتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جیسا کہ ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری نے محسوس کیا ہے ۱۸۵۷ء کے آس پاس تک ہندی کا لفظ اکثر زبان اُردو کے ہم معنی استعمال ہوا ہے لہٰذا لفظ 'ہندی' کی موجودگی سے ہندی زبان کی تقدیم از خود ثابت نہیں ہو جاتی۔''[۱۲]

ہندی نام آغاز میں صرف کھڑی بولی کے لیے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی کم و بیش تمام بولیوں کے لیے ہی مستعمل رہا۔ یہ نام 'ہند' کی مناسبت سے تھا۔ گریرسن نے 'لسانیاتی جائزۂ ہند' میں واضح کیا ہے کہ ہندی سے دو معنی مراد لیے جاتے ہیں، ایک 'سنسکرت آمیز کھڑی بولی' اور دوسرا 'پنجاب سے بنگال تک کی تمام بولیاں'۔ ہندی کا تیسرا مفہوم حقیقت سے زیادہ قریب ہے جس کے مطابق شورسینی سے ماخوذ کھڑی بولی کو ہندی اور بعض اوقات ہندوی کہا گیا۔ امیر خسرو نے نہ صرف اپنے کھڑی بولی کلام کو ہندوی کلام کہا بلکہ اس سے پہلے مسعود سعد سلمان کے مقامی زبان میں کلام کو بھی ہندوی کلام بتایا۔ مسعود سعد سلمان کا کلام چوں کہ دستیاب نہیں اس لیے اس کی زبان کے بارے میں تو کوئی حتمی رائے قائم کرنا محال ہے لیکن امیر خسرو کی زبان ہندوی کو موجودہ اردو اور ہندی کا قدیم رُوپ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ مرزا خلیل احمد بیگ لفظ 'ہندی' کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ''لفظ ہندی نہ تو ہندی الاصل ہے اور نہ سنسکرت نژاد۔ اسی طرح نہ یہ تدبھو ہے اور نہ تت سم۔ یہ لفظ خالص فارسی ترکیب سے بنا ہے۔ نو وارد مسلمانوں نے جب یہاں سکونت اختیار کی تو انھوں نے اس ملک کو 'ہند' کے نام سے یاد کیا۔ لفظ 'ہند' کی تشکیل سندھ کی 'س' کی 'ہ' (ہائے ہوز) میں تبدیلی سے عمل میں آئی ہے، کیوں کہ سنسکرت کے بعض الفاظ کی 'س' فارسی میں 'ہ' میں بدل جاتی ہے..... اس طرح لفظِ 'ہندی' خالص مسلمانوں کی ایجاد اور دین ہے۔ چنانچہ 'ہندی' سے مراد ہند یعنی ہندوستان سے

نسبت یا تعلق رکھنے والا یا ہند میں سکونت اختیار کرنے والا قرار پایا۔ یہی لفظ ہند میں بولی جانے والی بولیوں کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ جب مسلمانوں نے ۱۱۹۳ء میں دہلی پر اپنا سیاسی تسلط قائم کیا تو ان کا واسطہ یہاں کی کھڑی بولی سے پڑا جسے وہ دھیرے دھیرے اپناتے گئے۔ انھوں نے اسے 'ہندی' اور کبھی کبھی 'ہندوی' کہنا شروع کیا۔ بعد میں اسی زبان کو ریختہ بھی کہا گیا۔ 'ہندی'، 'ہندوی' اور 'ریختہ'۔ یہ اُردو زبان کے ہی مختلف نام ہیں جو قدیم زمانے میں پڑے۔''[۳]

چودھویں صدی عیسوی میں اس زبان نے گجرات اور دکن کا رُخ کیا تو وہاں اسے گجری اور دکنی / دکھنی کا نام ملا لیکن یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ابتدائی گجری اور دکھنی شاعری کی زبان کو بسا اوقات ہندوی بھی کہا گیا۔ ہندوی شاعری پر فارسی کا رنگ غالب آنے لگا تو اُس دور میں ملا وجہی نے اس زبان کو 'زبانِ ہندوستان' کہا۔ دکن کے باشندے شمالی ہند کو عموماً ہندوستان کہا کرتے تھے سو یہاں سے یہ دل چسپ نکتہ سامنے آتا ہے کہ دکن والوں کو اس زبان کے اصل مسکن شمالی ہند کا بخوبی احساس تھا۔ شاہ جہاں کے عہد میں پہلی دفعہ جب اُردو کا لفظ استعمال ہوا تو اس سے مراد زبان بالکل نہیں تھا۔ یہ لفظ شاہجہاں آباد میں قائم چھاؤنی (لشکر یا فوج کی جگہ) کے لیے استعمال ہوا تھا۔ جب قلعہ معلّٰی کے باہر ایک اُردو بازار قائم گیا تو اس سے مراد بھی ایسا بازار تھا جو قلعہ سے تعلق رکھنے والوں یا مغلیہ فوج کے عہدیداروں کے لیے ہو۔ 'اُردوئے معلّٰی' کی ترکیب زبان کے معنوں میں متعارف نہ ہوئی تھی بلکہ دربارِ عالیہ سے وابستہ لوگوں کے لیے تھی اور جب 'زبانِ اردوئے معلّٰی' بولا گیا تو اس سے مراد انھی لوگوں کی زبان تھی جو مغل فوج میں اعلیٰ عہدوں پر تھے، اشرافیہ سے تھے یا قلعہ معلّٰی سے کسی نہ کسی طرح وابستہ تھے۔ دوسری بات یہ کہ 'زبانِ اُردوئے معلّٰی' کبھی بھی عام لوگوں کی کھڑی بولی کو نہیں کہا گیا بلکہ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے اُن لوگوں کی زبان کو کہا گیا تھا جو پوری طرح فارسی کے غلبے تلے تھی۔ 'زبانِ اُردوئے معلّٰی' سے 'زبانِ اردو' اور پھر 'اُردو' بننے تک کا سفر کم و بیش دو سے اڑھائی سو سال میں طے ہوا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جس زبان نے زبانِ اُردوئے معلّٰی سے اُردو تک کا سفر کیا وہ عام لوگوں کی نہیں بلکہ اُس خاص طبقے کی زبان تھی جو فارسی سے پوری طرح مرعوب رہا۔ عام لوگوں کی زبان کا نام انیسویں صدی کے وسط تک عموماً ہندی ہی رائج رہا جو فارسی خط میں لکھی جاتی تھی حالانکہ اُس وقت ہندی کی سنسکرت آمیز شکل بھی فروغ پذیر تھی جو ناگری میں لکھی جا رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا مکمل اقتدار قائم ہونے کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے مختلف طبقات میں احیا کی سوچ پروان چڑھی تو ہندوؤں نے سنسکرت آمیز ہندی زبان کا پرچار تیز کر دیا اور ناگری خط کے سرکاری سطح پر رواج کی تحریک شروع کی۔ اس دور میں مسلمانوں نے اپنی زبان کے لیے ہندی کا لفظ ترک کر کے اُردو نام کا پرچار شروع کیا۔ اُن کی زبان کھڑی بولی ہندی (سنسکرت آمیز ہندی) سے زیادہ ترقی یافتہ صورت میں موجود تھی، وسیع ادبی سرمایے کی بھی حامل تھی سو اپنی

زبان کی برتری ظاہر کرنے کے لیے انھیں اتنی زیادہ محنت درکار نہ تھی جتنی کہ ہندی والوں کو۔

۱۹۰۰ء میں صوبہ جات شمالی و مغربی واودھ میں ناگری خط میں لکھی جانے والی ہندی کو سرکاری سطح پر رائج کر دیا گیا اور اس کے بعد دو زبانوں کے راستے مکمل طور پر جدا ہو گئے۔ اس سے قطع نظر انیسویں صدی کے وسط تک اُردو مصنفین بھی جب اپنی زبان کو ہندی لکھتے نظر آتے ہیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ لسانی تفریق ابھی بہت واضح نہیں ہوئی تھی یا کم از کم اس کا احساس ابھی اس قدر پروان نہیں چڑھا تھا جتنا بیسویں صدی میں نظر آتا ہے۔

اُردو اور ہندی کا ایک مشترک نام ہندوستانی بھی مروج رہا۔ عام خیال یہ ہے کہ مستشرقین نے 'ہندوستانی' نام کو فروغ دیا۔ ہندوستانی گرامر کی اولین تالیف ایک جرمن اسکالر جان جوشوا کیٹلر کی ہے جسے ڈچ زبان میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے سرورق پر ڈچ زبان میں رقم عبارت کا انگریزی ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

> "Instruction or teaching of the Hindustani and Persian languages, including their declension and conjugation also comparison of the Hindustani with the Dutch measure and weights and the meaning of some Moorish names etc."[۱۴]

کیٹلر کی گرامر کو تیج بھاٹیہ نے ترتیب دیا۔ اس کی اپنے موضوع کے اعتبار سے اہمیت سے قطع نظر ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں ہندوستانی اور فارسی کے باہمی رشتے پر روشنی ڈالنے کے علاوہ کیٹلر نے دکنی مسلمانوں کی زبان کے لیے 'مورس' کی اصطلاح استعمال کی۔ تیج بھاٹیہ لکھتے ہیں:

> 'He notes the dominance of three languages Hindustani, Persian, and "Moorish" on the Indian linguistic scene and describes their impact on each other and on the other Indian languages. The term 'Moorish' meant 'Muslim' in European languages of the time, but in the context of India it came to refer specifically to the Dakkini (Deccan) variety of Hindustani. This appears to be Ketelaar's meaning. It seems that he was not distinguishing Muslim and Hindu linguistic usage in northern India (now usually labeled 'Urdu' and 'Hindi'); in fact, his Hindustani lexicon shows considerable borrowing from Persian and Arabic. With respect to the second point, he notes the existence of geographical and ethnic varieties of Hindustani and stresses the wide-ranging impact of Persian. As evidence, Ketelaar points out

that although Hindustani can be written in native scripts, it is a common practice to write it in Persian letters.(۱۵)

کیٹلر نے یہ گرامر ۱۶۹۸ء میں لکھی۔ اُس وقت اگر وہ ہندوستانی سے مراد شمالی ہند میں بول چال کی وہ زبان لیتا ہے جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی تو یہ بلاشک وشبہ کھڑی بولی ہی تھی جس میں ابھی اُردو اور ہندی کی کوئی تفریق نہیں ہوئی تھی۔ دکن کی ادبی زبان جو ہندوی سے رشتہ توڑ کر فارسی سے جوڑتی محسوس ہوتی ہے کو کیٹلر نے 'مورس' کا نام دیا کیوں کہ اب وہ مسلمانوں کی نمائندہ بن رہی تھی۔ دوسری معروف گرامر ۱۷۴۵ء میں بنجمن شلزے نے لاطینی زبان میں 'Grammatica Hindostanica' کے عنوان سے لکھی تو اُس میں بھی عام بول چال کی زبان کے لیے ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد مختلف مستشرقین نے اس زبان کے قواعد اور لغت پر کام کیا اور سب کے ہاں یہ زبان 'ہندوستانی' کہلائی۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے اس زبان کی لغت دو جلدوں میں ترتیب دی۔ پہلی جلد ۱۷۸۶ء اور دوسری جلد ۱۷۹۰ء میں 'A Dictionary' English and Hindoostanee' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تو وہاں بھی شعبہ 'ہندوستانی' ہی قائم ہوا۔ کلکتہ میں انگریزوں نے پریس قائم کیا تو اُسے بھی 'ہندوستانی' پریس کا نام دیا جہاں سے فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات شائع ہوتی رہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں بادی النظر میں یہ تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ سترہویں صدی عیسوی کے اختتام پر انگریزوں کی بدولت کھڑی بولی کا نام 'ہندوستانی' پڑا لیکن 'ہابسن جابسن' کے ایک اندراج کے مطابق ۱۶۱۶ء میں ٹام کوریٹ نامی ایک سفیر نے جو مقامی زبان (جسے گنواری بھی لکھا گیا ہے) سیکھی اُس کا نام 'اندوستان' تھا۔[۱۶] گویا اس عام بول چال کے لیے استعمال ہونے والی زبان کا سترہویں صدی کے شروع سے ہی مستشرقین نے 'ہندوستانی راندوستانی' نام رکھ لیا تھا جو بیسویں صدی عیسوی تک چلتا رہا۔ مستشرقین کے ساتھ کچھ دیسی لکھنے والے بھی اپنی زبان کو 'ہندوستانی' لکھتے تھے لیکن بیش تر نے اسے ہندی رہندوی ہی لکھا تا آنکہ اسے عربی اور فارسی الفاظ سے پاک کر کے سنسکرت آمیزی سے نئی تخصیص نہ کر دی گئی۔ پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی اس زبان کو 'ہندوستانی' نام دینے کے حق میں نہیں کیوں کہ یہ تقریباً اُردو کا مترادف ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''بارہویں اور تیرہویں صدی میں ترکی فتح کے بعد سے شمالی ہند (مشرقی پنجاب سے بنگال تک) کی رائج زبان کا قدیم ترین اور آسان ترین نام ہندی ہے اور میں اسے اسی قدیم مفہوم میں استعمال کرتا ہوں جو آج بھی عوام الناس کے درمیان موجود ہے۔ ہندوستانی بہت بعد کی اور بوجھل ترکیب ہے۔ یہ خالص فارسی لفظ ہے اور عام طور پر اس کا مطلب ہوتا ہے ہندی کی مسلمان شکل یعنی اُردو جس میں فارسی عربی الفاظ کی بہتات ہے اور جس میں سے اصل ہندی اور سنسکرت عناصر خارج کر

دیے گئے یا بہت کم کر دیے گئے۔ ہندوستانی لسانیات کے بعض طالب علم اور انڈین نیشنل کانگریس کے بعض سیاسی اور سماجی کارکن اس لفظ ہندوستانی کو ذرا مختلف مفہوم میں استعمال کرنے لگے ہیں اور وہ اس سے وہ زبان مراد لیتے ہیں جو اعلیٰ ہندی (ناگری ہندی) اور اردو دونوں کی بنیاد ہے۔ لیکن ان کی کوششوں کے باوجود بہت سے انگریز اور دوسرے بدیسی لوگ نیز بہت سے ہندوستانی مسلمان ہندوستانی اور اُردو دونوں اصطلاحوں سے ہندی زبان کا ایک ہی اسلوب مراد لیتے ہیں جسے فارسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے اور جو فارسی عربی الفاظ کو ترجیح دیتی ہے۔'' ۱۷

پروفیسر چٹرجی نے بارہویں تیرہویں صدی عیسوی میں ہندی کا جو رائج مفہوم بتایا ہے اسی کی وجہ سے مستشرقین نے 'ہندوستانی' نام کو ہندی پر ترجیح دی۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے صرف ہند آریائی خاندان کی بولیوں کو ہی نہیں بلکہ دراوڑی خاندان کی بولیوں کو بھی مجموعی طور پر 'ہندی' کہہ دیا جاتا تھا۔ انگریزوں نے شمالی ہند اور بالخصوص دہلی اور اس کے گردونواح کی زبان کے لیے 'ہندوستانی' کی اصطلاح استعمال کی۔ باقی جہاں تک اُردو سے مماثلت کا تعلق ہے تو یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس وقت کی اُردو اور ہندی ایک ہی زبان تھی۔ گویا 'ہندوستانی' دراصل کھڑی بولی کا ہی دوسرا نام ہے۔ انیسویں صدی کے نصف دوم میں جب ہندی تحریک کو بنارس سے توانائی ملی اور ہندو دانشوروں کی قیادت میں اس نے زور پکڑا تب 'ہندوستانی' نام کی مخالفت ہوئی۔ اس مخالفت کی وجہ 'ہندوستانی' میں فارسی اور عربی الفاظ کی موجودگی تھی۔ اسی لیے 'ہندوستانی' کو اُردو کا دوسرا نام قرار دیا گیا اور ہندی زبان کو ہندوستانی سے الگ سمجھا جانے لگا۔

کھڑی بولی کی اُردو اور ہندی میں تقسیم سے پہلے ہی اسے 'ریختہ' کا نام بھی دیا گیا۔ یہ نام اُردو شعرا کے کلام اور تذکروں میں زیادہ ملتا ہے۔ شروع میں اسے سراج اور ولی ایسے شاعروں کی 'فارسی آمیز اُردو شاعری' کے معنوں میں استعمال کیا گیا۔ ولی کا کلام شمالی ہند میں پہنچے کے بعد ایک طرف فارسی سے مرعوب کھڑی بولی کی شاعری کو نظمِ ریختہ کہا گیا تو دوسری طرف ایسی زبان میں لکھی جانے والی نثر کو بھی 'نثرِ ریختہ' کہنے کی روایت ملتی ہے۔ شمالی ہند کی ادبی زبان کے لیے اس سے زیادہ مصنوعی اور قابلِ اعتراض نام کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس نام سے زبان کو ایک خاص تہذیبی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ 'ریختہ' مسلمان شعرا کی فارسی سے مرعوبیت کی منادیٔ عام تھی۔ ہندوستان میں زبانوں اور بولیوں کے نام ان کے جغرافیے کی مناسبت سے رواج پانے کی ایک قدیم روایت موجود تھی۔ امیر خسرو نے اپنے زمانے کی ہندوستانی زبانوں کے نام سندھی، لاہوری، کشمیری، تلنگی، گجر (گجری)، دہلی، اودھ (اودھی) اور بنگال (بنگالی) وغیرہ علاقوں کی مناسبت سے ہی بتائے تھے۔ امیر خسرو کے صدیوں بعد جب دہلی کی اشرافیہ کی زبان 'زبانِ اُردوئے

معلیٰ ہوئی تو اسے فوراً قبولیتِ عام حاصل نہ ہوسکی۔ اس نام کی خوش قسمتی یہ تھی کہ حکومتی سطح سے اس کا آغاز ہوا۔ سرکار دربار کے ساتھ قربت نے اس نام کو اہم تو بنا دیا لیکن قبولیتِ عام حاصل کرنے میں پھر بھی اسے دو صدیاں لگ گئیں۔ ریختہ کو اٹھارویں صدی عیسوی کی اختراع ماننا چاہیے جب اس کے ساتھ 'ہندوستانی' نام عام استعمال ہو رہا تھا۔

زبان کا نام اُس کی موجودہ یا قدیم صورتوں کا حقیقی آئینہ دار ہوتا ہے نہ ہی اس کے تبدیل ہونے سے زبان کی صحت متاثر ہوتی ہے۔ یہ تو ایک طرح سے کسی مضمون کے عنوان کی مانند ہے جو ایک سے زیادہ بھی قائم کیے جا سکتے ہیں اور تبدیل بھی ہو سکتے ہیں۔ اُردو اور ہندی میں حدِ فاصل کھڑی ہونے سے قبل دونوں زبانوں کے مشترک نام 'ہندی' 'ہندوی' 'ہندوستانی' صدیوں تک مستعمل رہے۔ ناموں کی اہمیت بہت زیادہ نہ سہی لیکن اپنی سطح پر بہرصورت یہ اُردو اور ہندی کی وحدت کی ایک جہت ضرور ہیں۔

اُردو اور ہندی کی وحدت کا سب سے نمایاں اظہار لسانی اشتراک کی صورت ہوتا ہے جس کی تین سطحیں ہیں۔ صوتی، قواعدی اور لفظی۔ لسانیات کسی زبان کے مطالعے کے لیے اُس کی بول چال کو اہمیت دیتی ہے نہ کہ لکھی ہوئی صورت کو۔ لسانیات کی وہ شاخ جس میں آوازوں کا سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے صوتیات (Phonetics) کہلاتی ہے۔ صوتیات میں آوازوں کی بنا پر ہی مختلف زبانوں کی تخصیص کی جاتی ہے۔ آوازوں کی درجہ بندی کے لیے ان کے مخارج کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دو اقسام بنالی گئی ہے۔ ایک مصوتے اور دوسری مصمتے۔ انسانی تکلم کا براہِ راست تعلق سانس لینے کے عمل سے ہے۔ سانس لینے کے لیے جب انسان ہوا اندر کی طرف کھینچتا ہے تو بولنا ممکن نہیں ہوتا، تکلم کے سلسلہ اُس وقت شروع ہوتا ہے جب ہوا پھیپھڑوں سے ہو کر منہ کے ذریعے باہر خارج ہوتی ہے۔ مصوتے (Vowels) وہ آوازیں ہیں جن میں آواز کے اعضاء گونج کے خلا بناتے ہیں اور جن میں سے سانس کی ہوا بغیر کسی رگڑ کے گزر جاتی ہے جب کہ مصمتے (Consonants) وہ آوازیں ہیں جن میں سانس کی ہوا کو اپنے راستے میں کوئی رکاوٹ ملتی ہے جس سے رگڑ پیدا ہوتی ہے۔ ۱۸ اُردو رسم الخط میں تین حروف (ا، و، ی) کو مصوتے کہا جاتا ہے۔ 'و' اور 'ی' چوں کہ بطور نیم مصوتہ یا حرفِ صحیح بھی استعمال ہو جاتے ہیں اس لیے صرف 'ا' کو ہی بنیادی مصوتہ تسلیم کیا جانا چاہیے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو میں یہی ایک مصوتہ ہے۔ اُردو مصوتوں کی تعداد بھی ہندی مصوتوں کی طرح دس ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ اُردو میں اعراب کے استعمال اور کچھ حروف کے ضمنی استعمال سے مصوتوں کو ظاہر کیا جاتا ہے جب کہ ہندی میں دس مصوتوں کے لیے باقاعدہ علامتیں موجود ہیں جن میں ماتراوں (ہندی اعراب) کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ اُردو اور ہندی کے مصوتوں کی بنیاد خالصتاً ہند آریائی لسانی روایت ہے اور ان دونوں

زبانوں میں مصوتوں کی سطح پر مکمل وحدت پائی جاتی ہے۔ جہاں تک مصمتوں کی بات ہے تو اُردو مصمتوں میں سے ہکار آوازیں (بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، ڑھ، کھ، گھ) تمام کی تمام خالصتاً ہند آریائی ہیں اور ہندی میں بھی اسی طرح موجود ہیں۔ اُردو رسم الخط میں اس کے لیے صرف ایک علامت 'ھ' موجود ہے جسے سادہ آوازوں والے حروف کے ساتھ لگا کر یہ آوازیں ظاہر کی جاتی ہیں جب کہ ہندی رسم الخط میں ان مرکب آوازوں کے لیے مخصوص اور مفرد حروف موجود ہیں۔ ہکار آوازوں کے ساتھ معکوسی آوازیں ٹ، ڈ، ڑ بھی اُردو اور ہندی دونوں میں مشترک ہیں۔ دیگر مصمتوں میں ب، پ، ت، ج، چ، د، ر، س، ش، ک، گ، ل، م، ن، و، ہ، ی دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔ ان آوازوں میں سے 'ن' کی ایک سے زیادہ آوازیں ہندی میں موجود ہیں جب کہ اُردو میں اس کی صرف ایک آواز ہے۔ اُردو کی کچھ آوازیں خالصتاً عربی ہیں جن میں ث، خ، ز، ژ، غ، ف، ق شامل ہیں۔ یہ ہندی میں موجود نہیں اور ان کی جگہ بالترتیب س، کھ، ج، گ، پھ، ک کی آوازیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اُردو اور ہندی کے صوتی اشتراک کے حوالے سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ:

> ''اُردو کی تقریباً چالیس آوازوں میں صرف چھے ایسی ہیں جو فارسی عربی سے لی گئی ہیں باقی سب کی سب ہندی اور اردو میں مشترک ہیں۔ خاص طور سے سادہ اور ہکار بندشی آوازیں بھ، پھ، دھ، تھ، کھ، گھ، چھ، جھ، بیس کی بیس پورے سٹ کی حیثیت سے ہندی اور اُردو میں تو موجود ہیں لیکن ایسا سٹ نہ فارسی میں ہے نہ عربی میں۔ اس کے علاوہ معکوسی آوازیں یعنی ٹ، ڈ، ڑ اور ان کے ہکار روپ ٹھ، ڈھ، ڑھ بھی ہندی اور اُردو میں مشترک ہیں۔ سوائے ڑ کے جس کو پراکرتوں کے تدبھو رجحان کے تحت اُردو والے سادہ بنا لیتے ہیں، گویا گنتی کی چند آوازوں کو چھوڑ کر اُردو اور ہندی کے مصمتوں کا ڈھانچہ تقریباً ایک جیسا ہے۔ مصوتوں میں تو صوتی ہم آہنگی سو فی صدی ہے۔ ہندی اور اُردو دونوں کے بنیادی مصوتے دس ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں۔''[19]

اُردو اور ہندی کی صوتی وحدت پر روشنی ڈالتے ہوئے کرسٹوفر شیکل اور رپرٹ سنیل نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دونوں زبانوں کے مصوتوں کی تعداد تو دس ہے لیکن مصمتوں میں فرق ہے اور یہ سنسکرت اور عربی فارسی کے دخیل الفاظ کی روشنی میں زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

> "The phonological structure of a language is determined by the distribution of its phonemes, i.e. those sound whose substitution by another affect the meaning of a word. Like most NIA[New Indo-Aryan languages], HU[Hindi Urdu]has a rather simple 10-vowels system albeit with the further possibility of

contrast through nasalization, and a much more complex system of consonants. The complexity of the intrinsic IA[Indo-Aryan] consonantal system is further compounded by the existence of loan-phonemes from S[Sanskrit] and Perso-Arabic(PA) which are somewhat differently treated in H[Hindi]and in U[Urdu] respectively.' [۲۰]

صوتی ہم آہنگی کے بعد اُردو اور ہندی کی وحدت کا اگلا واضح ثبوت مشترکہ قواعد اور بنیادی ذخیرہ الفاظ ہے۔ ماہرینِ لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ زبانیں ایک دوسرے سے الفاظ مستعار لیتی رہتی ہیں اور بسا اوقات اُنھیں مستقل طور پر اپنے اندر ضم بھی کر لیتی ہیں لیکن کبھی بھی کوئی ایک زبان کسی دوسری زبان کا بنیادی قواعدی ڈھانچہ اختیار نہیں کرتی۔ صرف اور نحو کے اعتبار سے جب اُردو اور ہندی ایک ہی طرح کے اصولوں پر استوار نظر آتی ہیں تو اس حقیقت کا ثبوت بھی بنتی ہیں کہ ان کی اصل ایک ہی کھڑی بولی ہے۔ ان دونوں زبانوں میں دخیل الفاظ اور رسم الخط کی بنا پر عمل میں آنے والی تقسیم کو دو سو سال گذرنے کے باوجود بول چال کی اُردو اور ہندی پر غور کریں تو بنیادی اسما، تذکیر و تانیث کے اصول، اسم کی مختلف حالتیں، اسمائے صفات، افعال، ضمائر، حروف، محاورات، کہاوتیں یہاں تک کہ ستر سے اسی فیصد لفظیات بھی مشترک ہیں جو دونوں زبانوں کی وحدت کا نمایاں اظہار ہے۔

اُردو اور ہندی کو گو کہ دو منفرد زبانوں کی حیثیت سے پہچان حاصل ہے اور یہ اپنے اپنے تہذیبی دھاروں پر ارتقا پذیر ہیں لیکن ان کا مشترک ماخذ، ماضی کے مشترک نام، صوتی ہم آہنگی اور قواعدی یکسانیت اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ موجودہ صورتیں صرف دو تہذیبی ترجیحات کا نتیجہ ہیں وگرنہ جتنا گہرا رشتہ ان دونوں میں موجود ہے دنیا کے کسی خطے کی دو زبانوں میں کم ہی نظر آئے گا۔

حواشی:

1. Grierson, G.A. Linguistic Survey of India, Vol. 9, Part. 1, Low Price Publications, Delhi, 1927, P.1

۲۔ جین، گیان چند، ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۵ء، ص ۵۶۔

۳۔ ایضاً، ص ۲۸۸۔

۴۔ جین، گیان چند، عام لسانیات، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۸۷۴۔۸۷۵۔

۵۔ جین، گیان چند، لسانی رشتے، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۴۔

۶۔ ایضاً،ص۱۵۳

۷۔ دلوی،عبدالستار،دوزبانیں،دوادب،دائرۃ الادب،باندرہ ممبئی،۲۰۰۷ء،ص۱۷۷

۸۔ خلیل احمد بیگ،مرزا،اُردوٗ ہندی اور ہندوستانی،مشمولہ: اُردو زبان کی تاریخ،مرتبہ،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ، ۲۰۰۷ء،ص۳۹۵

۹۔ شرما،رام ولاس،ذاتوں کی زبان کا ارتقا اور اُردو،مشمولہ: اُردوٗ ہندی دانشوروں کی نظر میں،مرتبہ: ڈاکٹر سید حامد حسین،انجمن ترقی اُردو(ہند)،نئی دہلی،۱۹۸۳ء،ص۹۲۔۹۳

۱۰۔ نارنگ،گوپی چند،ڈاکٹر،اُردو اور ہندی کا لسانی اشتراک-I،مشمولہ: اُردو زبان اور لسانیات،سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۷ء،ص۷۸

۱۱۔ احتشام حسین،سید،مقدمہ: ہندوستانی لسانیات کا خاکہ از جان بیمز،دانش محل،لکھنؤ،۱۹۵۷ء،ص۳۷

۱۲۔ حامد حسین،سید،ڈاکٹر،مقدمہ: اُردوٗ ہندی دانشوروں کی نظر میں،ص۲۹

۱۳۔ خلیل احمد بیگ،مرزا،اُردو زبان کا تاریخی تناظر،مشمولہ: گھر جو تقسیم ہوگیا،مرتبہ: شیخ سلیم احمد،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۲۰۰۷ء،ص۱۲۸۔۱۲۹

14. Bhatia, Tej K. The Oldest Grammar of Hindustani, Syracuse Scholar (1979-1991), University in Syracuse, New York, Vol No. 4: Issue No. 2 P. 5

15. Ibid. P.9-10

16. Hobson-Jobson: The Definitive Glossary of British IndiaEdited by: Henry Yule, A. C. Burnell, Kate Teltscher. Oxford University Press, Oxford, 2013, P. 259

۱۷۔ چٹر جی،سنیتی کمار،ہند آریائی اور ہندی،مترجم: عتیق احمد صدیقی،قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان،نئی دہلی، ۲۰۰۱،تیسرا ایڈیشن،ص۱۲۵

۱۸۔ اقتدار حسین خاں،ڈاکٹر،لسانیات کے بنیادی اُصول،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۱۹۸۵ء،ص۲۵

۱۹۔ اُردو اور ہندی کا لسانی اشتراک-I،مشمولہ: اُردو زبان اور لسانیات،ص۸۳۔۸۴

20. Shackle, Christopher, Hindi and Urdu Since 1800: A common reader, (Co-author: Rupert Snell), Heritage Publishers, New Delhi, 1990, P.24